محمد لقمان
پی ایچ۔ڈی سکالر،
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر محمد ارشد اویسی
صدر شعبہ اُردو
لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

اکبر اور اقبال کا فلسفۂ زندگی

Akbar and Iqbal were the classical poets of the Sub-Continent. Akbar ironically and sarcastically depicted every aspect of life, whereas Iqbal has serious style of expression. Human life has great value in their philosophy. He presented great values of life in his poetry. In their philosophy, life is time being and temporary. He hated the life of remissness and sluggishness. He considered life as a temporary thing. In his philosophy, life is full of conceit. His philosophy of life is in accordance with the Holy Quran.

اکبراور اقبال کی فکر میں فلسفہ حیات اور انسانی زندگی کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔انسانی فلسفہ اخلاق کے حوالے سے انھوں نے جو شاعری کی ہے اس سے انسانی تخلیق کے مقاصد سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ان کا یہ فلسفہ زندگی کی حقیقی غرض و غایت کو اجاگر کرتا ہے۔اس کائنات میں سب سے عزیز ترین متاع زندگی ہے جسے کوئی شخص کھونا نہیں چاہتا۔ہر شخص ہزاروں سال جینا چاہتا ہے اور زندگی کے لطائف سے حظ اٹھانا چاہتا ہے۔زندگی میں مسرتوں کے حصول کی آرزو کرنا کوئی غیر حقیقی فعل نہیں۔

اکبر کا فلسفہ زندگی انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان اپنی تخلیق کی غرض و غایت سے بیگانہ ہے۔انسان کو جب عرفان ذات ہو گا اور اپنی حقیقت سے باخبر ہو جائے گا تو انسانی معاشرہ دنیا میں ہی جنت کا نمونہ پیش کرے گا۔معرفت ذاتِ اور تخلیق کے مقاصد سے آگاہی انسان کو معاشرہ کا ایک مفید فرد بنا سکتی ہے۔صغریٰ مہدی اس

حوالے سے رقم طراز ہیں:

"ان کے بیان میں گہرائی اور گیرائی ہے، خلوص اور والہانہ پن ہے۔انھوں نے بچپن سے اپنے گھر میں تصوف کا چرچا سنا تھا۔اس پر غور کیا تھا۔جہانِ فانی میں انسان کی کیا حیثیت ہے ؟ جس کو وہ ہوش کہتا ہے۔وہ "ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں" والی کیفیت ہے۔اس کے علاوہ حقائق زندگی کا بیان ہے۔زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے ؟ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ دنیا میں رہ کر انسان کو کن کن حالات سے نبردآزما ہونا پڑتا ہے۔ان مسائل کو انھوں نے جا بجا بیان کیا ہے۔"(۱)

دیکھیے اکبر ان اشعار میں انسانی زندگی کے فلسفے کو کتنے خوب صورت انداز میں پیش کرتے ہیں:

ہر ایک کو ہے زمانے میں زندگی مقصود
کسے خبر ہے کہ مقصودِ زندگی کیا ہے؟

مرنے والا مر گیا اور رونے والا رو چُکا
وائے بر ہستی اگر مقصود ہستی ہو چکا

دنیا کی طوالت بے حد ہے خلقت کا تو لمبا قصہ ہے
ہر شخص فقط یہ غور کرے اس کل میں میرا کیا حصہ ہے

اکبر کا فلسفہ زندگی قرآن کریم سے مطابقت رکھتا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "**وما خلقت الجن والانس الالیعبدون**" (بے شک ہم نے انسان اور جن کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا)۔اکبر نے اپنے کلام میں جو تصورِ زندگی پیش کیا ہے وہ مقصدیت سے معمور ہے۔ان کا فلسفہ زندگی مغرب کے اس فلسفے سے متصادم ہے جس میں انسانی زندگی کا مقصد فقط عیش و عشرت کے ارد گرد گھومتا ہے۔اکبر نے عدل و انصاف ، رواداری ، معاشرتی مساوات ، مخلوق سے نیک سلوک اور عبادت الٰہی کو انسانی زندگی کامقصد قرار دیا ہے۔ان کے فلسفہ زندگی میں نیک اعمال ، آخرت کی فکر اور یادِ الٰہی کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔تبسم نظامی اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

"جس طرح شعلے کا تصور بغیر روشنی کے نہیں آ سکتا اسی طرح ہم کو اپنی زندگی کا احساس بغیر خدا کے تصور کے نہیں ہونا چاہیے لیکن افسوس کہ ہم خدا کو بھول بیٹھے ہیں۔پھر بھی ہمیں اپنی

زندگی اور اپنے وجود کا احساس ہے۔ یہ ہماری انتہائی بدنصیبی ہے کہ خدا ہم سے ایسا علیحدہ ہو گیا ہے کہ اب زندگی میں بسا اوقات اس کا تصور بھی پیشِ نظر نہیں رہتا۔"[۲]

زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی
ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں
اس خانہ ہستی سے گزر جاؤں گا بے لوث
سایہ ہوں فقط نقش بہ دیوار نہیں ہوں
اس زندگی میں ترکِ تعلق کا ذکر کیا
جب تن میں جان ہے ہمہ تن احتیاج ہوں

دنیا کی زندگی تو ہے اِک جزوِ موت ہی
اس کا نتیجہ ہو نہیں سکتا سوائے موت
سانچا یہ زندگی ہے فقط روح کے لیے
جب ڈھل چکے تو سانچے کو جائز ہے آئے موت

اکبر زندگی کو فریب اور دھوکا قرار دے کر اچھے عمل کی تلقین کرتے ہیں۔وہ زندگی کو خالق کاشکر اداکرنے کا موقع قرار دیتے ہیں۔وہ دنیاوی لذتوں میں اپنے آپ کو مشغول نہیں کرتے۔وہ زندگی کو نصاب ، روح کو امتحان اور قرآن کو معلومات کا ذریعہ Source قرار دیتے ہوئے ہر ذی حیات میں دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا احساس پیدا کرتے ہیں۔انھوں نے اپنے فلسفہ زندگی میں کہیں بھی دنیا کی طلب نہیں کی۔ان کے ہاں سیکڑوں اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کہیں سنجیدہ اور کہیں مزاحیہ انداز میں خامہ فرسائی کی گئی ہے۔وہ بزمِ ہستی میں زندگی کو طلسم بے مثال کہتے ہیں جو جسم بن کر جان سے لپٹی ہوئی ہے۔ آخر کار فنا ہو جاتی ہے۔عشرت رحمانی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ اکبر کا کلام زندگی کا فلسفہ ہے اور کمال یہ ہے کہ کہیں سنجیدگی سے اور کہیں ظرافت اور شوخی کے دلفریب انداز میں انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈال کر قدم قدم

پر ہمیں پیغام بیداری دیا ہے۔''[۳]

اکبر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

اب قوم میں زندگی کے آثار نہیں
جو اہلِ نظر ہیں اس سے شرمندہ ہیں

زندگی سے اب طبیعت سیر ہے
موت کیوں آتی نہیں کیا دیر ہے

زیست بے وقعت ہوئی ہے میرے شوقِ زیست سے
موت حیراں ہے مرا مرنے سے ڈرنا دیکھ کر

حقیقت کیا مری ہستی کی اک ذرے سے بھی کم ہوں
بحمد للہ مری ہستی نہیں ہے بار فطرت پر

تعجب اس پہ آتا ہے کہ میں بھی جزو عالم ہوں
زمیں پر ہوں تو سبزہ ہوں گلوں میں ہوں تو شبنم ہوں

اکبر کو بے عملی اور غفلت کی زندگی سے نفرت تھی۔وہ اپنی زندگی کو غنیمت جان کر آخرت کی تیاری کرتے ہیں۔دو روزہ زندگی میں وہ جاہ و حشمت پر غرور کرنے والوں پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ زندگی نے تو دارا اور سکندر جیسے مشاہیر کو مہلت نہیں دی۔زندگی سانس چلنے سے عبارت ہے۔اجل جب سر پر آ پہنچتی ہے تو انسان بے بس ہو جاتا ہے۔وہ اپنے فلسفۂ زندگی میں اعمال صالح کی ترغیب دیتے ہوئے اس زندگی کو دارِ فانی میں امتحان قرار دیتے ہیں۔چنانچہ وہ اپنے فلسفے میں اللہ کا خوف اور بزرگوں کے ادب کی تاکید کرتے ہیں۔ماہر القادری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ان کی شاعری کو ''زندگی'' سے اتنا گہرا ربط ہے کہ ''شعر اکبر''اور ''زندگی''کے مابین خطِ امتیاز کھینچنا مشکل ہے۔تعمیر و اصلاح ان کا مقصود تھا۔''[۴]

حقیقت زیست کی پیری میں ہم سمجھے تو کیا سمجھے
بڑا دھوکا دیا ظالم نے دنیا سے خدا سمجھے

وہی دنیا میں ہے اس زندگی و موت کا خالق
ہر ایک کو اپنی مرضی سے جلایا اور مارا ہے
دو روزہ زندگی ہے جاہ حشمت پر نہ ہو غافل
فریدوں ہے نہ کیخسرو و سکندر ہے نہ دارا ہے
یہ جب تک سانس چلتی ہے سمجھتے ہو ہمیں ہم ہیں
اجل جب سر پر آ پہنچی تو پھر کیا بس ہمارا ہے

اکبر ان لوگوں پر کفِ افسوس ملتے ہیں جو زندگی کو مقصدِ حیات سمجھ کر لہو و لعب میں مشغول ہیں۔ وہ بار بار زندگی کے حقائق کو سمجھنے کا درس دیتے ہیں۔ وہ زندگی کو بحر ہستی قرار دے کر اس کی حدود سے ناآشنا ہیں۔ وہ زندگی کو تلاطم سے تشبیہ دیتے ہیں جس کو ساحل کی خبر نہیں ہے۔ وہ انسان کے سینے میں چلنے والے سانس کو اس کی روح اور جان میں تکلیف دہ پھانس قرار دیتے ہیں لیکن غفلت کی وجہ سے اس کا درد محسوس نہیں ہوتا۔ وہ انسانی ہستی کو گرداب فنا میں غرق ہونے والی ناپائیدار لہریں کہتے ہیں۔ ہر گام پر نظر آنے والی قبریں ، اجڑی ہوئی بستیاں اور ویران گھر انسانوں کے لیے سامان عبرت ہیں۔ اس حوالے سے اکبر لکھتے ہیں:

ہستی کی یہ لہریں دام نظر دم بھر میں نشان ان کا نہ اثر
گرداب فنا میں غرق ہیں سب دریا ہیں رواں افسانوں کے

بزمِ ہستی میں رہا اکبر تو کیا اس کی خوشی
حکم جب یہ ہے کہ بے حد مضمحل ہو کر رہے

بزمِ ہستی ہے طلسم بے مثال زندگی
خاک ہے پروانہ شمع جمالِ زندگی

اقبال کے فلسفۂ شاعری میں انسانی زندگی کو اساسی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے فلسفہ کا مقصد انسانی زندگی کی بہترین تشکیل و تکمیل ہے۔ وہ انسان میں عملی قوت پیدا کر کے اسے صاحبِ آفاق بنانا چاہتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر عظمتِ انسانی اور انسان دوستی کے شاعر ہیں۔ وہ انسان کو کائنات میں مرکزی حیثیت دیتے ہیں۔ ان کے تمام افکار و خیالات انسان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کے گرد

گھومتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری کے توسط سے انسانی زندگی کے مسائل کے حل کا فریضہ انجام دیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

"وہ انسان سے محبت کرتے ہیں۔وہ اس کی عظمت کے قائل ہیں ، انھیں اس کے صحیح منصب کا احساس ہے، زندگی اس سے جو تقاضے کرتی ہے اس کا وہ گہرا شعور رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ حیات و کائنات میں اس کی اہمیت کا احساس دلا کر اس کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا سکھاتے ہیں۔وہ اس کو نئی زندگی، اس کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کے احساس و شعور سے اس طرح آشنا کرتے ہیں وہ اپنے جنوں کے لیے نئے ویرانوں کی تلاش کرتا ہے اور نئے آسمانوں پر پرواز کرنے کو اپنانصب العین بناتاہے۔"(۵)

اقبال نے اپنے فلسفۂ زندگی میں انسان اور انسانی زندگی کی پوری حقیقت کو واضح کیا ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کا جو تصور پیش کیا ہے ،وہ حسین اور دلآویز ہونے کے ساتھ ساتھ ہنگامۂ محشر سے کسی طرح کم نہیں ہے۔انسانی زندگی ہر لحہ ہنگامہ کار زار کی کیفیت میں مبتلا رہتی ہے۔انسان اس ہنگامہ کا خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا۔اسے اس نظامِ فطرت میں اپنی قوت و قابلیت کے جوہر دکھانے پڑتے ہیں۔ڈاکٹر اسلم انصاری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"وہ حقیقی خارجی زندگی کو رد نہیں کرتے بلکہ اسے انسان کا میدانِ عمل قرار دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ خارجی زندگی ان مقاصد عالیہ کے تابع ہوتی چلی جائے جو انسان کے شعور و ادراک میں متجلی ہوتے ہیں۔"(۶)

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضا دیکھ
یہ کوہ ، یہ صحرا، یہ سمندر ، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل جو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ
سمجھے گا زمانہ تری آنکھ کے اشارے

اقبال نے اپنے فلسفہ میں مادیت اور مادہ پرستی کو انسانی زندگی کے لیے مضر قرار دیا ہے۔

انھوں نے انسانی عقل کو ابو لہب اور عشق کو مصطفیٰؐ کہا ہے۔انھوں نے عشق کو وصل کی موت اور آرزو کو زندگی کی علامت قرار دیا ہے۔وہ عشق کو انسانی زندگی کا کمال سمجھتے ہیں۔اوراسے انسانی زندگی کے لیے لازمی سمجھتے ہیں۔اسی کے سبب ذوق و شوق کی پرورش ہوتی ہے۔اسی کے سہارے انسان زندہ رہتا ہے۔اسی کی وجہ سے انسانی زندگی میں حرکت اور تڑپ پیدا ہوتی ہے۔عشق سے انسانی زندگی میں جذب و شوق کی لہریں دوڑتی نظر آتی ہیں۔

اقبال کی شاعری انسانی نظریۂ حیات کی شاعری ہے۔انھوں نے اپنے کلام میں انسان کو جہد مسلسل اور کوشش پیہم کی ترغیب دی ہے۔انسانی زندگی اور کائنات کے ان گنت اسرار و رموز کو اپنے فلسفہ میں پیش کیا ہے۔انھوں نے اپنے کلام میں حیات و کائنات کی حقیقتوں کو اجاگر کیا ہے:

زندگی سرمایہ دار از آرزو ست
عقل از زائیدگانِ بطن اوست
دست و دندان و دماغ و چشم گوش
فکر و تخیل و شعور و یاد و ہوش
زندگی مرکب چو درجنگاہ باخت
بہر حفظِ خویش ایں آلاتِ ساخت

جسٹس ایس اے رحمان رقم طراز ہیں:

"حیات ایک انجذابی اور ترقی پذیر فعلیت ہے اور راستے کی تمام مزاحمتوں پر اسی انجذابی قوت سے قابو پا لیتی ہے۔اپنے کلام میں اکثر مقامات پر اقبال اسے عشق سے موسوم کرتے ہیں۔حیات کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ یا فطرت ہے لیکن فطرت غیر حقیقی ہے نہ منبع شر۔اسی مزاحمت سے حیات کی داخلی قوتوں کو نمود کا موقع میسر آتا ہے۔پیہم جدوجہد سے راستے کی سب رکاوٹوں سے نبردآزما ہوتا ہوا نفس انسانی ، آزادی کی طرف رواں ہے۔اس کی موجودہ حالت جبر و اختیار کے بین بین ہے۔جیسا کہ ایک حدیث شریف میں آتا ہے ''کوئی محدود نفس ذات مطلق کے مقام کو نہیں پا سکتا'' اس لیے سفر حیات ایک نہ ختم ہونے والا سفر ہے۔یہی کوشش پیہم اس کے دوام کی ضامن ہو سکتی ہے ۔حیات اس سفر کے دوران نئے مقاصد اور تازہ تازہ آرزوئوں کی تخلیق کرتی ہے اور اس طرح اپنے

تحفظ اور توسّع کا اہتمام کرتی ہے۔اعضائے حواس عقل وغیرہ سب آلات ہیں جو حیات نے اپنی مقصد برداری کے لیے تدریجی ارتقا کے واسطے سے پیدا کیے ہیں۔"(۷)

اقبال نے اپنے کلام میں مسلمان کے لیے مردِ مومن کی اصطلاح استعمال کی ہے۔اقبال اللہ اور اس کے رسولؐ پر کامل ایمان رکھنے والے پکے اور سچے مسلمان تھے۔انھوں نے اسلام کے نظام کو انسان اور اس کی زندگی کے لیے مثالی نظام قرار دیا ہے۔اسلام کا نظام ان کے ہاں ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔یہ نظام ہی انسان اور اس کی زندگی کو معراجِ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔اقبال نے انسانی زندگی میں اپنے مثالی کردار مردِ مومن کے ذریعے انقلاب برپا کر دیا ہے۔انھوں نے اس عظیم انسان کے کردار، شخصیت اور سیرت میں زندگی کی تڑپ پیدا کر دی ہے۔ان کے ہاں انسان کی زندگی کا مثالی نظام وہ ہے جس کی بنیاد اخوت، محبت، مساوات، رواداری، احساس اور عدل و انصاف پر رکھی گئی ہے۔یہ اعلیٰ صفات پیدا کر کے وہ انسانی زندگی کو عزت و احترام کی دولت سے مالا مال کرنا چاہتے ہیں۔انسان جب اپنی زندگی کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے تو مظاہر فطرت اس کے لیے تسخیر کر دیے جاتے ہیں۔زندگی اس کے اشاروں پر چلتی ہے۔یہ کمالِ خودی ہے۔ان کے فلسفۂ حیات انسانی کی معراج یہی ہے۔یہ وہ مقام ہے جہاں مظاہر فطرت اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں:

دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہو کے شرارے
تعمیر خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ
تیری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

ڈاکٹر عبادت بریلوی اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

"اسلامی نظام ان کے خیال میں ہر اعتبار سے مکمل ہے اور ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو انسان اور انسانیت کو معراج کمال تک پہنچا دیتا ہے۔اس نظام میں پرورش پانے اور زندگی بسر کرنے کی وجہ سے انسان کے اندر بے شمار چھپی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور وہ ان کے سہارے زندگی کے

راستے پر آگے کی طرف بڑھتا ہے اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔محبت ، فراست اور جذب و شوق کی مشعلیں اس کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں اور وہ ان مشعلوں کی روشنی میں انسانی زندگی کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں تلاش و جستجو اس کا مزاج بن جاتی ہے۔"(۸)

ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"اقبال ہمارے اکثر روایتی شعرا جو زندگی کے ہاتھوں ہر وقت بیزار اور نالاں رہتے ہیں کے برعکس زندگی کی بقا کے معتقد ہیں۔اقبال کے مکتب فکر میں زندگی ایک غیر فانی جوہر ہے جو بہر تقدیر قائم رہتا ہے۔وہ گویا ازل سے ابد تک بہتا ہوا دھارا ہے۔اقبال کے نزدیک صرف زندگی ہی وجود رکھتی ہے اور اس کے برعکس موت کا فی الواقع کوئی وجود نہیں بلکہ موت بھی زندگی ہی کی حالتوں میں سے ایک حالت ہے۔"(۹)

اقبال اس حوالے سے لکھتے ہیں:

کھول آنکھ زمیں دیکھ ، فلک دیکھ ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی ضیاء دیکھ
اس جلوہ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکہ بیم و رجا دیکھ

زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اُڑ گیا

اقبال زندگی کو حقیقت قرار دیتے ہیں۔وہ اسے ارتقائے حیات کی منزلوں میں سے ایک منزل قرار دیتے ہیں۔وہ انسانی زندگی کو ایک مسلسل اور لامتناہی تحریک سمجھتے ہیں۔انھوں نے اپنے فلسفہ میں زندگی کے لیے علم کو ضروری قرار دیا ہے نہ کہ زندگی کو علم کے لیے لازمی سمجھا ہے۔ان کے ہاں حیاتِ انسانی کا مقصد محض اشیاء کا ادراک نہیں ہے بلکہ وہ حقیقت کے ادراک کو حیات انسانی کا مقصد قرار دیتے ہیں۔انسانی زندگی ایک معمہ ہے۔انسانی فکر اس عقدہ مشکل کو حل کرنے میں کوشاں رہتی

ہے۔ یہ معمہ عقل و خرد کی قوت سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کی حقیقت ذوق معرفت کے سوا معلوم نہیں ہو سکتی۔ عارفین اور صوفیا نے معبود حقیقی کا قرب حاصل کر کے زندگی کے سربستہ راز معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے نزدیک شاہد ذات کی تجلیات کا مشاہدہ ہی انسانی زندگی اور انسانی فطرت کا مقصود ہے۔

حوالہ جات

۱۔ صغریٰ مہدی، اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، دہلی: مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۱۹۸۱ء، ص:۱۸۱

۲۔ تبسم نظامی، تذکرہ اکبرالہ آبادی، مکتبہ سلطانی، ۱۹۴۸ء، بمبئی ص:۴۱

۳۔ عشرت رحمانی، لسان العصر، مشمولہ: اکبر اس دور میں، مرتبہ: اختر انصاری اکبر آبادی، کراچی: بزمِ اکبر، ۱۹۵۱ء، ص:۲۲۰

۴۔ ماہر القادری، جزویست از پیغمبر، مشمولہ: اکبر اس دور میں، مرتبہ: اختر انصاری اکبر آبادی، کراچی: بزمِ اکبر، ۱۹۵۲ء، ص۱۰۹

۵۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اقبال احوال و افکار، مکتبہ عالیہ، ۲۰۰۹ء، لاہور ص:۶۷

۶۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، شعر و فکر و اقبال، بزمِ اقبال، ۲۰۱۵ء لاہور، ص:۹۴

۷۔ ایس۔اے رحمان، جسٹس، اقبال اور مسئلہ ارتقا، مشمولہ: صحیفہ اقبال، مرتبہ: یونس جاوید، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۸۶ء، ص:۴۸۔۴۷

۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اقبال احوال و افکار، ص:۱۷

۹۔ محمد اکرم شاہ، ڈاکٹر، اقبال اور حقیقتِ موت، مشمولہ: اقبال شناسی اور راوی، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۸۹ء، ص:۲۲۹